Negotiations 5:2 (Dec 2025) pp. 85-103 ISSN: 2789-293X

اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں نومارکسیت

Neo-Marxism in 21 st Century Urdu Short Stories

Muhammad Shoaib Khan
Scholar PhD Urdu, NUML Islamabad.
khan.shoaib@gmail.com

KEYWORDS

Urdu Fiction
Class Conflict
Neo-Marxism
Tradition
Modernity
Social Justice
Contemporary
Marginalize
Socio Political

DATES

Received	**03-10-2025**
Accepted	**28-10-2025**
Published	**31-12-2025**

QR CODE

ABSTRACT

This article examines the representation Neo-Marxism in 21st century Urdu short Stories. The rapidly changing economics, social, and political landscape. This study explores the presence and signifies of neo Marxism provides critical stories. Neo Marxism provides a critical framework to examine class conflict, economic exploitation, power structures and social inequalities in contemporary society society, though an analysis of selected Urdu short stories, this research highlights how written gap between the rich and the poor, the alienation of the individual, and the struggle of marginalized groups. The study revels that Urdu function not only reflects social realities but also critiques the ideological forces that shape them. By exposing the mechanisms of power and economic control, neo Marxism of in understanding the deeper socio political message embedded in Urdu short fiction. The finding show that Urdu short story servers as a dynamic literary site where resistance.

https://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/article/view/173

تلخیص:

یہ آرٹیکل اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں نو مارکسیت کی نمائندگی کا جائزہ لیتا ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے معاشی، سماجی اور سیاسی منظرنامے کے تناظر میں یہ مطالعہ اردو افسانوں میں نو مارکسیت کی موجودگی اور معنویت کو واضح کرتا ہے اور منتخب افسانوں کے تنقیدی مطالعے کے لیے ایک فکری و نظریاتی فریم ورک فراہم کرتا ہے۔ نو مارکسیت عصری معاشرے میں طبقاتی کشمکش، معاشی استحصال، طاقت کے ڈھانچوں اور سماجی ناہمواریوں کے تجزیے کے لیے ایک مؤثر تنقیدی زاویہ مہیا کرتی ہے۔ منتخب اردو افسانوں کے تجزیے کے ذریعے یہ تحقیق اس امر کو اجاگر کرتی ہے کہ افسانہ نگار کس طرح امیر اور غریب کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج، فرد کی بیگانگی اور حاشیے پر موجود طبقات کی جدوجہد کو پیش کرتے ہیں۔ یہ مطالعہ انکشاف کرتا ہے کہ اردو افسانہ نہ صرف سماجی حقائق کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اُن نظریاتی قوتوں پر بھی تنقید کرتا ہے جو اِن حقائق کی تشکیل میں کردار ادا کرتی ہیں۔ طاقت اور معاشی کنٹرول کے طریقہ کار کو بے نقاب کرتے ہوئے نو مارکسیت اردو افسانے میں مضمر گہرے سماجی و سیاسی معانی کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو افسانہ ایک متحرک ادبی فضا کے طور پر ابھرتا ہے جہاں مزاحمت، شعور اور تنقیدی آگہی کی صورتیں نمایاں ہوتی ہیں۔

مارکسیت یا جدید مارکسزم ۲۰ ویں صدی کے وسط میں ۱۹۳۰ء کی دہائی کے بعد سامنے آئی ہے۔ یہ مارکسزم کے کلاسیکی تصورات کو جدید حالات کے مطابق نئی تشریحات دینے میں مدد کرتی ہے۔ نو مارکسزم میں ثقافتی، نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلوؤں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ نو مارکسی مفکرین میں انتھونی گرامشی، ہربرٹ مارکوز، فرانسز فینن اور لودوگ فوسٹر جیسے افراد شامل ہیں۔ نو مارکسزم نے مارکسزم کے اقتصادی مادیتEconomic determinism پر تنقید کی اور زیادہ توجہ سماجی و ثقافتی پہلوؤں جیسے تشہیر، ثقافتی اداروں اور افراد کی نفسیات پر مرکوز کی ہے۔ ان میں انتھونی گرامشی ایک اطالوی مارکسٹ نظریہ دان تھا جس نے کتاب "جیل کی نوٹ بک" میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ ان کا نظریہ ہیگمونی) قیادت، غلبہ (تھا جو کہ ایک ایسا تصور ہے جو کہ معاشرے میں طاقت کے استعمال کو سمجھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکمران طبقہ اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لیے معاشرے پر اپنا تسلط قائم کرتا ہے۔ وہ سیاسی اور معاشی طاقت کے ساتھ ساتھ ثقافتی اور نظریاتی طاقت بھی استعمال کرتے ہیں۔ اپنی ہیگمونی کو برقرار رکھنے کے لیے مذہبی اقدار کو بھی استعمال کرتے ہیں جس سے لوگوں کی مالی مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے معاشی استحصال، عدم مساوات، بے روزگاری، کم اجرت، معاشی ترقی کی محدودیت، قرضوں کا بوجھ، معاشی بے یقینی اور استحصالی نظام جیسے مسائل درپیش آتے ہیں۔ وہ اپنے نظریات کی روشنی میں معاشی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔

سماجی طبقات میں سب سے بڑا محرک معیشت ہے۔ معاشرے کے اندر دو طرح کے لوگ رہتے ہیں ایک وہ لوگ جو تعداد میں کم ہیں مگر قدرتی اور مصنوعی وسائل کے مالک ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو تعداد میں زیادہ ہیں مگر ان کے پاس خاص ذریعہ

معاش نہیں۔ اس وجہ سے یہ لوگ معاشی بدحالی کی زندگی گزارتے ہیں۔ معیشت بھی ملک میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ معیشت سے ہی لوگوں کا معیار زندگی جڑا ہے اور انکے معیار زندگی کا بہتر یا ناکام ہونا بھی اسی سے ہے۔ معاشی حوالے سے طبقاتی شعور ایک اہم موضوع ہے اسی طبقاتی شعور کی وجہ سے اپر کلاس لوئر کلاس اور مڈل کلاس تخلیق پاتی ہیں۔

انیسویں صدی کے کارل مارکس ایک قد آور اور جدید نظریے کے سب سے بڑے داعی تھے۔ نومارکسیت یا جدید مارکسزم بیسویں صدی کے وسط میں ۱۹۳۰ء کی دہائی کے بعد سامنے آئی ہے۔ یہ مارکسزم کے کلاسیکل تصورات کو جدید حالات اور واقعات، خیالات کے مطابق وضاحت دینے میں مدد دیتی ہے۔ نومارکسیت مارکسزم میں نفسیاتی، ثقافتی اور فلسفیانہ پہلوؤں کو مختلف طریقوں سے پیش کرتا ہے۔

انتھونی گرامشی نے اس وقت کے مروجہ بہت سے فلسفیانہ اور اخلاقی رجحانات سے انحراف کیا ہے اور ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد ڈالی جس میں صرف اشراکیت کو نہیں بلکہ بہت سارے نئے فلسفے کو جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ نومارکسیت کو سمجھنے کے لیے مارکسی نظریے کے مفکر کارل مارکس کی ذہنیت اور سوانح حیات کو سمجھنا لازمی ہے۔ کارل مارکس ۵ مئی ۱۸۱۸ء میں پرشیا کے ٹرائر یا نامی شہر میں پیدا ہوئے۔ جس خاندان میں مارکس نے آنکھ کھولی وہ خاندان بیروک طرز تعمیر پر بنا تھا جو یہودی فرقے کے ماننے والے تھے۔ اس کی ماں ایک گھریلو خاتون تھی جس نے ساری زندگی بچوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ مارکس نے عیسائی مذہب کو اپنی پیدائش کے آٹھ سال بعد اختیار کر لیا۔ مارکس ٹرائرس میں وکالت کے شعبے سے منسلک تھے۔ وہ انسان دوستی اور ترقی پسند خیالات پر یقین رکھتے تھے۔

مارکس نے جس زمانے میں آنکھیں کھولی یورپ کے لیے وہ سیاسی اعتبار سے عموما اور جرمنی کے لیے خصوصا بحرانی اور نازک دور تھا۔ اس وقت فرانس کے انقلاب کے اثرات بھی تازہ تازہ تھے۔ ۱۸۶۸ء کے انقلابات کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ صنعتی انقلاب انگلستان میں رونما ہو چکا تھا۔ جاگیر دار طبقے سے اقتدار کی بھاگ دوڑ نکل کر سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ آچکی تھی۔ جرمنی میں سرمایہ دار طبقے کے باوجود جاگیر درانہ طبقہ حاوی تھا جو سرمایہ دار طبقے کی راہ میں حائل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان کی دنیا میں جان لاک کی تجربیت رائج ہو چکی تھی۔ ہیگل کے فلسفے کا سکہ جرمنی میں اب چل چکا تھا۔ مارکس بھی طالب علمی کے دور ہی سے ہیگل سے خاصا متاثر تھا۔ وہ بہت زیادہ اس کے فلسفے میں دلچسپی لیتا تھا۔ مارکس قانون کے شعبے سے منسلک تھے۔ جب قانون کے لیکچر ہوتے تو وہ بہت کم ان میں شرکت کرتے تھے۔ زیادہ تر وقت جرمنی کی تاریخ کلاسیکیات کے وسیع مطالعے پر خود کو مصروف رکھتے۔ مارکس کے اس زمانہ سرگرمی کے سلسلے میں موززیس نے یوں اظہار خیال کیا ہے:

> اس نوجوان مارکس نے تمام ہیگلیوں پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ غالباً یہ نوجوان موجودہ دنیا کا واحد شخص ہے جسے فلسفی کہا جاسکتا ہے۔ اس میں گہرا فلسفیانہ خلوص بھی موجود ہے اور چبھتی ہوئی طنز سے بھری ذہنیت بھی۔(1)

مارکس نے اپنی کتاب Manifesto the Communist Kapital میں سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظریات پیش کیے۔ معاشرتی تبدیلیوں کا تصور مارکسزم میں اقتصادی اساس پر مبنی ہے۔ مارکس کا ماننا ہے کہ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتا جب تک سرمایہ درانہ نظام میں محنت کش طبقے کا حصہ نہ ہو۔ محنت کش طبقہ جب اس نظام کے خلاف بغاوت کرتا ہے تو اس نتیجے میں کمیونسٹ اور سوشلسٹ ڈرخائم کی معاشرتی نظام کی تھیوری انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں سامنے آئی۔ نومارکسزم کی نئی شاخ ہے جو صرف معاشی نہیں بلکہ تعلیمی، نظریاتی، ثقافتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو اپنے اندر شامل کرتی ہے تاکہ جدید دنیا کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔ اس حوالے سے پروفیسر عتیق اللہ رقمطراز ہیں:

> "انتھونی گرامشی کا تصور ریاست صرف جبر سے نہیں بلکہ نظریاتی غلبے کے نظریے سے بھی عوام کو کنٹرول کرتا ہے۔ سرمایہ دار طبقہ، ثقافت، تعلیم اور میڈیا وغیرہ کے ذریعے عوام کی سوچ کو تشکیل دیتا ہے۔"(2)

معاش کی ذمہ داری معاشرے کے اندر ہر افراد پر لاگو ہوتی ہے۔ کیونکہ معاشی مسئلے سے نبٹنے کے لیے مفید لائحہ عمل مفید لائحہ عمل اور قابل عمل طریقے کو تشکیل دیا جاتا ہے۔ فریضہ معاش سے محدود دائرے کے اندر رہتے ہوئے کس طرح ہلال رزق حاصل کیا جاتا ہے۔ فریضہ معاش سے محدود دائرے کے اندر ہوئے کس طرح ہلال رزق حاصل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ معاش کی ذمہ داری زیادہ تر گھر کے سربراہ کے اوپر ہوتی ہے۔ گھر کا سربراہ اپنی بنیادی ضروریات اور وسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی نہ کسی پیشے سے وابستہ ہوتا ہے۔ کیونکہ معاش ایک بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے اور یہ ذمہ داری گھر کا سربراہ بہت احسن انداز سے نبھاتا ہے۔ معاش کے بغیر زندگی کا پہیہ نہیں چل سکتا۔ گھر، مکان اور رہائش کے ساتھ ساتھ پیٹ کی بھوک مٹانا ایک زندہ افراد کی ذمہ داری ہے۔ اس وجہ سے وہ کسی ن کسی پیشے سے منسلک رہتا ہے تاکہ اس قسم کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں:

> "اس ادارہ خاندان میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ اس نظریے سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے سیدھی بات ہے کہ کسی بھی ادارے کے دو برابر کے سربراہ نہیں ہو سکتے۔ آپ کسی محکمے میں دو ڈائریکٹر بنا دیں تو ادارہ تباہ ہو جائے گا۔ تو اس کا اس منیجر ڈائریکٹر ایک ہی ہو گا۔ اس کے نزدیک آپ دس ڈائریکٹر بھی بنا دیں تو کوئی حرج نہیں۔ ہر شعبے کا ایک ہی منیجر بنا دیں۔"(3)

انتھونی گرامشی ۱۸۹۱ء میں اٹلی میں پیدا ہوئے۔ اس کی وجہ شہرت فلسفی، سیاسی مفکر اور مارکسی تھیورسٹ پر بنی۔ گرامشی نے نومارکسیت کے حوالے سے ایک نیا فلسفہ متعارف کروایا۔ اس کے مطابق سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقہ صرف معیشت پر نہیں بلکہ تعلیم، ثقافت، میڈیا اور مذہب کے ذریعے عوام کی سوچ پر بھی حکومت کرتا ہے۔ یہ نظریاتی غلبہ عوام کو بہت حد تک قائل کرتا ہے۔ اپنے استعمال کو درست اور فطری سمجھنے لگتا ہے۔ عصر حاضر میں طاقت ور طبقہ صرف بندوق کے زور پر نہیں بلکہ دماغوں پر قبضے سے حکمرانی کرتا ہے۔ گرامشی کہتا ہے کہ مذہب، عدلیہ اور میڈیا جیسے ادارے عوام کو سرمایہ درانہ نظام کے تابع رکھنے اور اس کے

ساتھ کام کرتے ہیں۔ یہ ادارے لوگوں کو بغیر جبر اور ظلم و ستم کے قابو میں رکھتے ہیں جو نرم طاقت کی ایک شکل ہے۔ گرامشی ایک نیا شعور پیدا کرنے کی دعوت عوام کو دیتا ہے تاکہ عوام خود کو نظریاتی غلامی سے آزاد کر سکیں۔ اس کے مطابق ادب، سیاسی عمل اور تعلیم کے ذریعے مزاحمت ممکن ہے۔ گرامشی کے نظریات نے نومارکسزم کو فقط معاشی تحلیل سے نکال کر ثقافتی تنقید کی جانب اس کا رخ موڑ دیا ہے۔ جدید ادبی تنقیدی تعلیم اور سیاسیات اور میڈیا میں گرامشی کے جدید نظریات کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ نومارکسزم جدید دنیا میں مارکسزم کی نئی تشریح ہے جو معیشت کے ساتھ ساتھ ثقافت، تعلیم اور نظریات کو بھی طاقت کی بنیاد سمجھتا ہے۔ انتھونی گرامشی اس فکری مکتب کے بہت اہم ستون ہیں جنہوں نے ثقافتی بالادستی کا تصور دے کر سرمایہ داری کی اصل طاقت اور اس کی حیثیت کو بے نقاب کیا۔ ان کے نظریات صرف معاشیات سیاست کو ہی نہیں بلکہ ادب اور فلسفے کو بھی نئے رخ دیتے ہیں۔ پروفیسر لاسکی (Laski) لکھتے ہیں:

> "(مارکسیت) مارکسزم کا جائزہ جس پہلو سے بھی لیا جائے کارل مارکس کی تصنیف سماجی فلسفہ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ مارکس کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے افراتفری کو کمیونزم کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اسے ایک تحریک کی صورت میں باقی رکھا۔ مارکس کی وجہ سے اسے ایک فلسفہ اور ہدایات کا درجہ حاصل ہو گیا۔"(4)

سرمایہ درانہ استعمال کے اسرار کو منکشف کرنے اور سرمایہ داری کے ارتقاء پذیری میں معاشی قوانین کی دریافت سائنٹفک کیمونزم کے نظریے کو سائنس کی سطح پر ہمکنار کر دیا۔ معاشی تحقیق کے دوران انہوں نے دوران اخذ کردہ ہر ایک نئے نتیجے کو اشتراکی انقلاب اور اشتراکی انقلاب اور اشتراکی سماج میں انقابی عبور کے حوالے مدلل کے لیے استعمال کیا۔

نومارکسیت ایک سیاسی نظریے کے ساتھ ساتھ چند اہم بنیادی قدروں کا حامل سماجی، معاشی اور نفسیاتی حامل ہے۔ نومارکسیت وہ فلسفہ حیات ہے جس کے تمام عالم اقوام پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ نومارکسیت نے خواص اور عوام دونوں پر اپنے دیرپا نقوش مرتسم کیے۔ اس فلسفے نے یورپی دانشوروں اور مزدوروں کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ براعظم کی کئی ممالک میں معاشی، سماجی اور اقتصادی انقلابات کے رونما ہونے میں بہت تاریخی رول ادا کیا۔ اس فلسفے کی بنیاد اگرچہ معاشیات اور سیاسیات سے متعلق تھی لیکن اس نے کم و بیش سماجیات کے پہلوؤں کو متاثر کیا۔ اس فلسفے کی جڑیں اٹلی، لاطینی، امریکہ اور افریقہ میں مضبوط کر لیں۔ ادب اور تاریخ کو معاشرتی علوم ک ساتھ ساتھ دوسری نئی سمعتوں سے روشناس کروایا۔ نومارکسیت ایک معاشرتی سائنس ہے جو دنیا اور اہل دنیا کے معاشرے سے بحث کرتی ہے۔ لینن نومارکسیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "انتھونی گرامشی کے نظریات اور تعلیمات پر مبنی نظام نومارکسزم ہے۔ یہ دو طریقوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک طرف سرمایہ دار اور دوسری طرف مزدور طبقہ۔ ایک طبقہ ظالم ہے اور دوسرا مظلوم۔ مزدور طبقہ محنت کرتا ہے اور سرمایہ دار طبقہ اس کی دولت کا فائدہ اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے۔"(5)

صدی کے اندر سماج دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک روایتی سماج اور دوسرا جدید سماج روایتی سماج قدیم روایات کا امین ہوتا ہے۔ وہ ان روایات میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں چاہتا ہے۔ اپنے بزرگوں کے رسم و رواج کی پابندی میں بہت فخر محسوس کرتا ہے۔ صدیوں سے ہی معاشرے کی عورت محکومی کا شکار رہی ہے۔ اس کو کسی قسم کی رائے دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اکیسویں صدی کی نمایاں ادیب خواتین کی بات کی جائے تو معاشی حوالے سے آواز بلند کرنے میں نمایاں نام خالدہ حسین کا آتا ہے۔ خالدہ حسین نے اپنی تحریروں میں سرمایہ داری اور اس کی کشمکش، طبقاتی اختلافات، خواتین کے سماجی مسائل غربت و بے روزگاری اور مہنگائی جیسے معاشی مسائل پر قلم اٹھایا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے طبقات کے معاشی مسائل کو بیان کیا ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں ایک ایسے سماجی ماحول کو پیش کیا ہے جو تعلیم یافتہ اور باشعور ہونے کے باوجود اپنی مرضی کی زندگی گزار نہیں سکتے۔ غربت و افلاس کی وجہ سے سماج کی لڑکیوں کو دولت مند زمینداروں سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مرتضیٰ علی اطہر لکھتے ہیں:

> مردوں کے بالادستی والے سماج کی پیدا کردہ بہت ساری خصوصیات دوسری ایشائی ممالک کی طرح یہاں بھی موجود ہیں۔ تشدد، جہیز کا رواج، خانگی مسائل، عصمت دری اور جنسی استحصال جیسی برائیاں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ لیکن پاکستان کی انفرادیت یہ ہے کہ سماجی جبر کے ساتھ ساتھ سیاسی جبر اور آمریت کے غیر جمہوری نظام کی موجودگی نے یہاں عورتوں کی حالت اور بھی زیادہ نازک کر دی ہے۔(6)

طبقاتی کشمکش اور سرمایہ داری کے شکار طبقات خالدہ حسین کا محبوب موضوع ہے۔ انہوں نے معاشرے کے معاشی مسائل کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ ایسے افراد یا خاندان جو نہ صرف معاشی نظام کا شکار ہیں بلکہ سرمایہ داری کی طاقت کا بھی شکار ہوتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں معاشی مسائل کے شکار افراد بے بس اور لاچاروں کے طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ معاشرے میں ایسے افراد کی حیثیت ایک بے جان شے کی مانند ہوتی ہے اور اپنی مرضی سے افراد زندگی بسر نہیں کر سکتے اور نہ ہی اپنی خواہشات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ خالدہ حسین کی کہانیوں میں افراد کا باطنی کرب، ذہنی کیفیات، مایوسی ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کے بہت سارے افسانوں میں گھریلو ماحول، جانے پہچانے کردار سرمایہ دارانہ نظام کے سبب ماورائی فضا میں زندگی کے کسی وسیع تناظر میں ایک سوالیہ نشان بن کر پھیل جاتے ہیں۔ ان کے موضوعات معاشی تناظر میں معاشرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ مرد اور عورت کائنات کے ہم معنی اجزاء ہیں۔ دونوں کا تعلق سماجی اور جسمانی رشتے میں ایسا الجھا ہوا ہے۔ کہ اس رشتے کا تعین نہایت مشکل ہے۔ ان رشتوں میں الجھاؤ اور سلجھاؤ ازل سے جاری و ساری ہے۔ مرد اور عورت سے ایک خاندان تشکیل پاتا ہے لیکن بدلتے ہوئے سماج کے پیش نظر حالات ابتر ہوتے جا رہے ہیں جس کی بدولت معاشی مسائل ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ خالدہ حسین اپنی کہانیوں کا تانا بانا ان سے ہی کے گرد بنا ہے۔ ڈاکٹر حمیرہ اشفاق لکھتی ہیں:

"خالدہ حسین اردو افسانے میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ ان کی کہانی کے کئی رنگ و آہنگ ہیں۔ جس کی واضح دلیل ان کے افسانوں کا موضوعاتی تنوع ہے۔ تانیثیت تصوف کی پر پیچ گھائیاں، وجودی فلسفہ و دیگر مغربی تحریکوں کے اثرات، عصری حقائق کی عکاسی، اقدار کی تنزلی اور علامت نگاری، ان تمام رویوں کو اپنانے کے باوجود ان کی تحریر عدم ابلاغ و کا شکار نہیں ہوتی۔"(7)

خالدہ حسین نے اپنے بہت سارے افسانوں میں جہاں مختلف موضوعات کے بارے میں لکھا ہے وہاں ان کے افسانوں کا ایک اہم موضوع معاشی مسائل بھی ہیں۔ معاشی مسائل کے حوالے سے خالدہ حسین نے سرمایہ داری ،اس کی کشمکش، طبقاتی اختلافات اور سماجی طاقت کی پیچیدگیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جن کا سماج کے ہاتھوں استحصال ہوتا ہے۔ خالدہ حسین نے مختلف حوالوں سے اس موضوع کو پیش کیا ہے۔ خالدہ حسین کے افسانوں میں خواتین کے سماجی مسائل کا کرب موجود ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں غربت اور بے روزگاری کے مسئلے کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک سے زیادہ افسانے خالدہ حسین کے ملتے ہیں۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام میں متوسط طبقے کے فرد کے حالات کو بیان کیا ہے کہ درمیانے طبقے کے لوگ بمشکل ضروریات زندگی پورا کرتے ہیں جس کی وجہ گھر کا سربراہ خاندان کو لباس پہنانے، ان کا پیٹ بھرنے اور دیگر گھریلو ذمہ داریوں میں مزدور کی طرح کام کرتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود محنت کش افراد کو کام کرنے والی مشین سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے اندر مرد اپنی عمر کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور کام کاج میں مصروف ہو جاتا ہے۔ گھر کا بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے اس پر دیگر بچوں کی کفالت کی ذمہ داری عائد کر دی جاتی ہے۔ اب وہ خاموشی کے ساتھ اپنی تمام خواہشات دبا کر سماج میں غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں سماج کے افراد جو مہنگائی اور قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں ان کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے اور خاندانی نظام میں تبدیلیاں اور ان کے اثرات جو سماج کی وجہ سے افراد پر مرتب ہوتے ہیں اس کی عکاسی نومارکسیت کے تناظر میں اپنے افسانوں میں کی ہے۔

ایسے لوگ محنت کی طرف نہیں جاتے بلکہ مختصر راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ تعویز گنڈوں کے ذریعے اپنے حالات بہتر بنا سکیں۔ نام نہاد سرمایہ دار اور پیر فقیر ایسے لوگوں کو اپنے شکنجوں میں پھنسا کر ان سے مال و دولت لوٹتے رہتے ہیں اور خود دن بدن بڑے سے بڑے محلوں اور گاڑیوں میں بیٹھتے ہیں۔ افسانہ "نامہ بر" میں سرمایہ دارانہ نظام کی کشمکش اور اس کی صورتحال کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

"گرمیوں کی اس خاموش دوپہر جب گھنٹی بجی تو مجھے معلوم ہوا کہ کوئی مجھے باہر بلاتا ہے۔۔۔ بی بی وہاں کیا کھڑی ہے آگے نکل۔ اس دہلیز سے باہر نکل تیرے نام پیغام آیا ہے سبز گنبد کے حضور سے سنا تو نے ۔۔۔ ایک دشمن بی بی تیری۔۔۔ تیری جیسی ڈھال۔ ناک نقشہ دم کی خبر رکھنے والی۔ تیرے ساتھ سایہ کی طرح لگی ہے۔ اس سے خبردار رہ بچہ، وہ تیرے سچے حرف مٹانے کی فکر میں ہے۔ شاہ عنایت اس کی بویا کر لوٹ جاتے ہیں مگر آپ یہ تیرا مقدر ہے۔"(8)

سرمایہ درانہ معاشرے کے اندر افراد کو یقین کروایا جاتا ہے جو اس کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے وہ اسے اپنا مقدر سمجھ کو قبول کرلے اور وہ اس مقدر سے کوئی گلہ نہ کرے یعنی کہ سرمایہ دار لوگ اور پیر فقیر افراد کو یہ یقین کروانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو جو کچھ ملا ہے وہ ان کے اپنے نصیب کی بات ہے۔ وہ اپنے نصیب سے الگ ہو کر کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ سرمایہ داری صرف ایک معاشی نظام ہی نہیں ہے بلکہ طرز زندگی اور ایک ذہنیت ہے جس میں منافع اور دولت کو انسانی اختلافات اور قدر پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کے برعکس پیر فقیری کا نظام بظاہر انسان دوستی، روحانیت اور قناعت پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ دونوں نظام صوفیانہ طرز فکر اور سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کیوں کہ اس کی کشمکش دور حاضر میں شدت اختیار کر چکی ہے۔ دولت کا ارتکاز سرمایہ داری میں مخصوص طبقے تک محدود ہوتا ہے۔ معاشی مسائل سے دوچار انسان کو صرف صارف سمجھا جاتا ہے۔ افراد کی قیمت اس کی آمدن اور اس کے مال و دولت سے ناپی جاتی ہے۔ اکیسویں صدی کی افسانہ نگار خالدہ حسین نے اپنے افسانے میں اس بات کی عکاسی کی ہے کہ خانقائیں بھی سرمایہ داری اور اس کی کشمکش کے زیر اثر آچکی ہیں۔ پیر فقیری اکثر جگہ پر کاروبار بن چکا ہے۔ سوشل میڈیا پر فقیر اب برینڈ بن کر سامنے آتے ہیں۔ روحانیت اور قناعت پسندی کو اب سوشل کر دیا گیا ہے۔ کئی جگہ پر پیری مریدی کا نظام سرمایہ دارنہ نظام کے مقصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> "خالدہ حسین کے افسانے اردو نثر میں نادر اور نایاب مظہر ہیں۔ مشرقی سرزمینوں میں شاعروں کی ساحری اور پیغمبری سے نسبت زمانہ قدیم سے چلی آتی ہے۔ اب خالدہ حسین نے افسانہ نگاری کو فرویت اور پیغمبری کا قیام دے رکھا ہے۔"(9)

خالدہ حسین کے افسانوں میں موجود افراد اپنی ذات کی اثبات، تشکیک، بے جا پابندیوں اور نہ ہونے کے احساس میں سمٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خالدہ حسین کے افسانوں میں موجود افراد معاشی مسائل، زندگی کی بے معنویت اور بے مقصدیت سے دوچار نظر آتے ہیں۔ خالدہ حسین کا افسانہ "دھوپ چھاؤں" میں افراد کے معاشی مسائل کی وجہ سے ان کی زندگی بے معنویت نظر آتی ہے۔ معاشی مسائل سے دوچار افراد اپنی زندگی کو بے مقصد تصور کرنے لگتے ہیں۔ ان کو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے ان پر ہر وقت نظر رکھے ہوئے ہے اور کوئی ان کی طاق میں ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار "مریم آپا" کا ہے۔ افسانے میں عورت کو دھوپ چھاؤں کہا گیا ہے کہ وہ دفتر، گھر، کچن اور بچوں کے کام کاج میں خود کو مصروف رکھتی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی ایک وہ سوچ ہے جس میں افراد کو مشین کی طرح کام کرنے والی ایک قوت سمجھا جاتا ہے۔ روایتی سماج کے اندر دیکھا جائے تو چار دیواری میں قید عورت دکھائی دیتی ہے۔ عورت کی حیثیت سرمایہ دارانہ نظام میں ایک مزدور سے بڑھ کر نہیں۔ ایک ایسا مزدور جسے بغیر اجرت کے ہی گھر میں مشین کی طرح تمام امور اکیلے نبھانا پڑتے ہیں۔ ایسی عورتوں کو گھروں کے اندر ہی استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورت کو سرمایہ دارانہ نظام نے دوہرا جبر و استحصال دیا ہے۔ ایک طرف عورت کا معاشی استحصال کیا جاتا ہے تو دوسری طرف روایتی اور سماجی نظام کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں:

"اگلے دن لکڑی کی دیوار کے پار غیر معمولی خاموشی تھی۔ اس نے دیوار کے ساتھ کان لگا کر سنا۔ چلنے پھرنے کی بڑی محتاط آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ بغیر کہیں دور گہرائی سے کوئی چیخ اٹھی جیسے کنویں میں سے بول رہا ہو۔"(10)

خالدہ حسین جیسی افسانہ نگار نے اس جبر کو جدید علامتی اسلوب میں ڈال کر پیش کیا ہے۔ کہ عورت کی ساری حیثیت ہمارے سامنے ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی کشمکش کی صورتحال کا جائزہ لیں تو سماج میں عورت کی حیثیت، تشکیک، عدم تحفظ اور نفرت کا شکار نظر آتی ہے۔ خدوخال درمیانے طبقے سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جانے پہچانے کردار تدبیر کاروں کے سبب زندگی کے تناظر کو فضا میں تبدیل کر کے پیش کرتے ہیں۔ عورتیں گھروں کے تمام امور کو سر انجام دیتی ہیں۔ جہاں دنیا اکیسویں صدی کے اندر بہت تیزی سے ترقی کر رہی ہے وہاں معاشی مسائل میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

انسان کی زندگی بہت زیادہ محدود ہے۔ چند ہزار دن کا اگر ایک وقت ہو تو بھی ایک نقدی ہے۔ جس طرح تیر کمان سے نکل جائے تو واپس نہیں آتا بالکل اسی طرح انسانی زندگی کا ایک دن بھی ضائع ہو جائے تو واپس نہیں آتا۔ نیلوفر اقبال نے اپنے افسانے "ڈیپارچر لاؤنج" میں انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو نہ صرف بیان کیا ہے بلکہ سماج کی عکاسی کی ہے کہ جس طرح ہم پیسے کو سوچ سمجھ کر خرچ کرتے ہیں بالکل اسی طرح وقت، صلاحیت، محنت اور وسائل کو بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ وقت انسانی زندگی کا بہت بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ سماج کے اندر غریب اور امیر سب کے پاس ایک جیسا وقت ہوتا ہے۔ مگر اس وقت کو استعمال کرنے کا طریقہ دونوں طبقوں کا مختلف ہوتا ہے اور اپنے اپنے وقت وقت کے مطابق امیر اور غریب زندگی کے معیار کا تعین کرتے ہیں ۔ معاشی شعور کی ضرورت اس وقت در پیش آتی ہے جب ہم پیسے کو غیر ضروری چیزوں پر خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ زندگی اور وقت دونوں کو معاشی دانش مندی سے گزارنا چاہیے کیونکہ غریب لوگ اکثر بغیر منصوبہ بندی کے بسر کر دیتے ہیں اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی تاحال کوئی کوشش نہیں کرتے اور ساری زندگی غربت، ناکامی اور پریشانی میں گزار دیتے ہیں۔ توانائی، پیسہ اور وقت یہ سب ایسے قیمتی وسائل ہیں جن کو فضول خرچی سے بچانا چاہیے۔ جو قوم اور فرد ان چیزوں کی قدر و قیمت نہیں جانتے اور ان کو اہمیت نہیں دیتے، وہ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں حمزہ علوی لکھتے ہیں:

"قرضہ جات کے اس نظام میں سرمایہ درانہ پیداوار کی اس تحریک نے جو آہستہ آہستہ جڑیں پکڑ رہی تھی وہ متبادل امکانات کو اجاگر کیا جنہیں دیسی سرمایہ درانہ نظام کی ترقی کی راہ میں حائل اہم ترین وجوہات میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے۔"(11)

سماجی تناظر میں نیلوفر اقبال نے افراد کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے کہ ہر فرد سماج کے اندر بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ سانس لیتا ہے، جیتا ہے، زندگی گزارتا ہے۔ ہر لمحہ اور ہر وقت ایک مسئلہ ہے۔ جسے اخلاق، عقل، سوجھ بوجھ اور فائدے کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ معاشرے کے اندر اکثر لوگوں کو یہ سوچ ہوتی ہے کہ وہ اگر تعلیم، صحت اور مہارت پر سرمایہ کاری کریں تو وہ اس پیسے کو

فضول خرچ کریں گے حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ تعلیم سے انسان کے اندر شعور پیدا کرتی ہے، صحت کے حوالے سے معلومات ملتی ہے اور مختلف مہارتوں میں مہارت حاصل کر کے انسان اپنے معاشی حالات کو بہتر بنا سکتا ہے۔ لیکن ان سب کے لیے عقل کو بروکار لانا بھی لازمی ہے۔ انتھونی گرامشی بھی اس بات کا قائل تھا کہ اگر انسان کو بہتر معیارِ زندگی گزارنا ہے تو معاشرے کے اندر اپنے معاشی مسائل کو بہتر بنانا اس کے لیے ضروری ہے۔ جب تک انسان کے معاشی حالات بہتری کی جانب گامزن نہیں ہوں گے تو وہ بہتر معیار زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس کی عکاسی نیلوفر اقبال نے اپنے افسانے کے اندر کی ہے کہ معیار زندگی کا بہتر ہونا معاش سے جڑا ہوا ہے۔

خالد فتح محمد نے افسانہ "میں" میں سماجی تناظر میں محکمہ جنگلات کے افسران کے حالات کی عکاسی کی ہے۔ حالانکہ انسان سماجی شعور، جذباتی و نفسیاتی شعور رکھنے والی ایک ہستی ہے۔ صرف گوشت پوست کا ایک ٹکڑا نہیں ہے۔ جب انسان کو اس کے مقام اس کے مرتبے سے نیچے دکھایا جائے یا غیر مربوط ماحول میں اس کو رکھا جائے تو اس پر سماجی، نفسیاتی اور وجودی بحران طاری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کا رشتہ بھی اس کے مقام سے جڑا ہوتا ہے:

> "محکمہ جنگلات کے اس مقامی افسر کی حالت بھی اُس بہروپیے جیسی تھی۔ افسر نے غور سے مجھے دیکھا۔ اُس نے بتایا کہ جس طرح انسان اجنبیوں میں اپنے آپ کو غیر مطمئن محسوس کرتا ہے اسی طرح درخت کو بھی نئی جگہ پر لگایا جائے تو وہ کئی دن اداس پریشان اور بجھا بجھا رہتا ہے۔ اس ماحولی حالات اثر انداز ہوتے ہیں۔ موسم اور لوگ پودے کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جیسے جیسے وہ نئی جگہ، ماحول اور لوگوں سے واقف ہو جاتا ہے اُس کی تازہ کونپلوں میں زندگی کے رنگ نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔۔۔ آفسر کے چہرے پر تمسخر میں ڈوبی حیرانی تھی۔ اس نے برتری مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔۔۔ وہ شاید یہ نہیں سوچتا تھا۔ میری کہ میری سوچ میری اپنی ذاتی ملکیت ہے۔ میں جو چاہوں سوچوں وہ میری صوابدید ہے۔ مجھے وہ افسر مطمئن نہ کر سکا۔"(12)

خالد فتح محمد نے افسانہ "میں" میں ماحولیاتی ادارے کے مسائل کی عکاسی کی ہے کہ سماج کے اندر انسان سے زیادہ محکمہ جنگلات کے افراد لکڑیوں کو فروغ دیتے ہیں۔ ماحول صرف پودے، درخت اور فضا نہیں ہوتے تعلقات اور سماجی ڈھانچہ بھی انسان کے اندرونی وجود پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ محکمہ جنگلات کا ادارہ ایک علامت بن کر ابھرتا ہے یہ ایک ایسا نظام ہے جو انسان سے کٹا ہوا ہے۔ لیکن فطرت سے اس کا گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ جب ایسے نظام میں انسان کو ڈھالا جاتا ہے جہاں شخصیت مغلوب ہو اور ادارے فرد کے اوپر حاوی ہوں جائے تو آہستہ آہستہ انسان اپنے آپ کو بے معنی محسوس کرنے لگتا ہے اس کو یوں لگتا ہے کہ اس کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ ایک بے کار شے کی مانند ہو گیا ہے۔ کیونکہ ایسے میں انسان احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور دوسروں سے قطع تعلق ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے اندر تنہائی، خوف جیسی کیفیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ محکمہ جنگلات میں کام کرنے والے افراد سماجی طور پر اپنی شناخت کو کھو بیٹھتے ہیں۔

انسان کے سماجی مقام سے انسان کی خودی منسلک ہوتی ہے۔ جب انسان کا مقام ہی کمتر کر دیا جائے تو وہ نفسیاتی تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ عزبت اور بے روز گاری کے سبب محکمہ جنگلات کے شعبہ سے لوگ منسلک ہو جاتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں روز گار سے منسلک ہو کر چند پیسے کمائے جاسکیں۔ جب ایسی جگہ پر افراد کو رکھا جائے جہاں وہ اپنی مزاج، ثقافت اور زبان سے ہم آہنگ نہ ہو تو لازما ایسے انسان سے بے شناخت ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر خداداد صلاحتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ماحول، خود اعتمادی، بے چینی اور شناختی بحران پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ افراد کا اپنا وجود غیر شخصی نظام میں کھونے لگتا ہے۔ عصر حاضر کا انسان ایک مصنوعی ادارے سے ہٹ کر اور فطرت میں زندگی بسر کرتا ہے تو اپنے احساس، پہچان اور وجود سے بیگانہ ہونے لگتا ہے۔ وہاں انسان کی خودی، اس کی شناخت اور اس کا احساس مجروح ہو جاتا ہے۔ مصنوعی لوگ مشینی ماحول میں رہتے رہتے اپنے آپ کو اسی طرح ڈھال لیتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں غربت اور بے روز گاری جیسے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ غربت معاشرے میں ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے انسان کوئی بھی پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے بے شک اس سے اس کی شناخت ہی کیوں نہ مجرح ہو جائے۔ سماجی تناطر میں معاشی مسلے کا سب سے بڑا حل بے روز گاری اور غربت کا خاتمہ ہے۔ اس کی عکاسی خالد فتح محمد نے یوں کی ہے:

> "محکمہ کا آدمی کچھ دیر کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ وہ پودے کے ساتھ مطمئن تھا۔ اس نے جب بتایا کہ پودا مادہ تھا تو میں شرما گیا۔ مجھے لگا کہ کسی نے مجھے قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیا ہے وہ آدمی میری کیفیت سے بے نیاز بتائے جارہا تھا کہ درخت کو پھول بھی نہیں لگتے۔ درخت کے مادہ ہونے کا مجھ پر عجیب سا اثر ہوا ہے۔ ایسے لگا جیسے درخت میری پرانی محبوبہ ہو جو طویل عرصے کے بعد واپس آئی ہو۔ میں اس کے ساتھ کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ مجھے پودا اس آدمی کی موجودگی میں شرماتے ہوئے محسوس ہوا۔ شاہد وہ بھی تنہائی ہی چاہتا تھا۔ اس آدمی نے مشورہ دیا کہ میں اس پودے کی طرف زیادہ توجہ نہ دوں کیوں کہ یہ ایک طرح سے بانجھ ہے۔"(13)

خالد فتح محمد نے افسانہ "میں" محکمہ جنگلات کے افسران کی سوچ کی عکاسی کی ہے کہ سماج میں محکمہ جنگلات کے افسران خود کو بڑے عہدوں سے منسلک کر لیتے ہیں لیکن دیگر افسران ان لوگوں کو کمتر محسوس کرتے ہیں۔ خالدہ حسین کا افسانہ "تفتیش" ایک شاہکار افسانہ ہے جس میں طبقات کی تقسیم کی عکاسی کی گئی ہے کہ معاشرے کے اندر طبقات کی تقسیم امیر غریبی کے فرد کی وجہ سے کی جاتی ہے۔

> "مجھے ایک تفتیش کے سلسلے میں بلایا گیا تھا۔ ملک و قوم کا مفاد جس سے وابستہ تھا اور امید کی گئی تھی میں اس بلاوے سے اغماض نہ کروں گی کیونکہ اس صورت میں میرے متعلق تمام تفصیلات محکمہ کے پاس پہلے سے ہی موجود ہیں مگر میں گھر میں اکیلی ہوں اور جمیل نہیں جانتے کہ مجھ پر یہ پرچہ آیا ہے۔ اور اگر جمیل کو معلوم ہو گیا کہ میں کس قسم کی تفتیش میں ملوث ہوں تو وہ ایک سرکاری ملازم ہیں اور اصولوں کے سختی سے پابند ہیں۔"(14)

خالدہ حسین کا افسانہ "تفتیش" میں سماجی ماحول میں جو معاشرے کے اندر طبقات کی تقسیم ہو چکی ہے نے کی مرکزی کردار ان اعلیٰ دار افسران کو اس بات کا احساس دلاتی رہی کہ وہ کسی بھی جرم میں مبتلا نہیں ہے وہ جو کچھ کہ رہی ہے وہ ہی سچ ہے۔ لیکن افسران اس کی کوئی بھی بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔

> "آپ کی ہٹ دھرمی یہاں نہیں چلے گی محترمہ۔ دوسرے نے تنگ آکر کہا۔ آپ کی یہ حرکت آپ کے خلاف گواہی دیتی ہے۔ ہمارا یہ آلہ کبھی غلط نتائج نہیں دیتا۔ اس کی مسلسل سرخ روشنی دیکھیئے اور ہمیں کسی اور رویے پر مجبور نہ کیجئے۔"(15)

بڑی کمپنیاں چھوٹے کاروباری اداروں پر قابض ہو جاتے ہیں اور محنت کش طبقے کا استحصال، کارخانوں اور فیکٹریوں میں محنت کرنے والے مزدوروں کو کم اجرت دی جاتی ہے۔ اپنے منافع میں سرمایہ دار اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ مہنگائی، تعلیم اور صحت میں بنیادی سہولیات سے عام طبقے کے لوگ محروم ہو جاتے ہیں۔ ایک نیا استحصالی ادارہ اس سے شروع ہوتا ہے۔ انسانیت اور اخلاقیات میں سرمایہ دارانہ نظام کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ حیثیت پیسے کو ہے۔ بڑی کمپنیوں اور سرمایہ دار لوگوں کے پاس بیشتر دولت جمع ہو چکی ہے اور وہی کمپنیاں، عدلیہ، سیاست، اور میڈیا پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ غریب عوام دوسری جانب دو وقت کی روٹی کے لیے ترس رہے ہیں۔ غربت، مہنگائی اور خاندانی نظام سرمایہ دارانہ نظام کے تلخ نتائج ہیں۔ اس کی عکاسی نیلوفر اقبال نے اپنے افسانے کے اندر یوں کی ہے:

> "آپ کے لیے اطلاع ہے کہ وزیر اعظم نے سپہ سالار کے ساتھ مل کر آپ کا تختہ الٹ دیا ہے اور تمام درباری بھی ان کے ساتھ ہیں۔ آپ کے لیے حکم ہے کہ آپ محل چھوڑ کر چلے جائیں۔ دیرینہ تعلقات کی بنا پر اس قدر رعایت دی گئی ہے کہ آپ کو جان سے نہیں مارا جائے گا۔ آپ صرف اٹیچی کیس اور والٹ میں جو رقم موجود ہے لے کر محل سے نکل جائیں، اور جتنا دور جاسکتے ہیں چلے جائیں، اور دوبارہ کبھی نظر نہ آئیں۔"(16)

سرمایہ دارانہ نظام ایک معاشی نظام ہے۔ اس افسانے میں نیلوفر اقبال نے بادشاہ وقت کی عکاسی کی ہے۔ اس میں نیلوفر اقبال نے معاشی اور معاشرتی حقائق کی عکاسی کی ہے۔ معاشرے میں عہدے، اقتدار اور رتبے کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اختیار اور طاقت کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس افسانے میں واحد متکلم کے کردار ہے جب اس کا منصب چھین لیا جاتا ہے تو وہی بااختیار شخص ایک عام انسان بن جاتا ہے۔ بے وقت انسان بعض اوقات بن جاتا ہے

دوسرا سماجی حقیقتوں کو بھی بے نقاب نہیں کرتا بلکہ فکری مزاحمت بھی اس کے خلاف پیدا ہوتی ہے۔ ثقافت کا غلبہ ہمارے معاشرے پر چھایا ہوا ہے کیونکہ ثقافت انسانی زندگی کا بھرپور نمونہ پیش کرتی ہے جو مل جل کر قوم کی حیثیت سے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ

معاشرت میں سرائیت کر جانے والا اور باہم متحد کر دینے والا ایک ہمہ گر نقطہ نظر ہے۔ جسے لوگ خاموشی کے ساتھ یا شعوری طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ اس حوالے احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "تہذیب ایک ملک کے فنون لطیفہ، فلسفیانہ خیالات، طرز معاشرت، مادی ترقی اور زندگی کے متضاد اور متصادم عناصر کو متوازن بنا کر اجتماعی زندگی میں ایک خوشگوار احساس پیدا کرنے سے الگ کوئی چیز نہیں۔(17)

ہمہ جاتی اسلوب حیات کا دوسرا نام ثقافت ہے جو تجربہ علم کی صورت میں جنم لیتے ہیں۔ ثقافت انسانی زندگی کے ہر پہلو کا حصہ ہے۔ یہ محض ذہنی تربیت، معاشرتی رویوں اور فنون لطیفہ تک محدود نہیں ہے بلکہ طرز حیات کو ثقافت قرار دیا جا سکتا ہے۔ سماج اور فرد کے رشتے کو ثقافت کا یہ تصور زیر بحث لاتا ہے۔ کیونکہ ثقافت سے ہی فرد جڑا ہوتا ہے

ایک مسلسل مکالمہ ہے جس میں فرد جنم لیتا ہے۔ انسانی دنیا سے ہی ثقافت تعلق رکھتی ہے اور اس کی تعمیر و تشکیل ثقافت سے ہی تشکیل پاتی ہے۔ ثقافت کی تشکیل، ترسیل اور تعمیل ہوتی ہے۔ علامتوں کے بننے کا عمل ثقافت کی تشکیل ہے۔ مبین مرزا افسانہ "گمشدہ لوگ" میں ثقافتی تناظر میں لکھتے ہیں:

> "مال روڈ پر واپڈا ہاؤس کے سامنے سے نکل کر وہ چیرانگ کراس پر آکر ٹھہر گئے۔ آدھی رات کو رئیس نے گاڑی مال کے سامنے روک دی۔ انجلی کو حیرت ہوئی کہ لینا دینا تو کچھ نہیں ہے۔ رئیس نے بتایا کہ ہم مال روڈ پر یوں ہی چلتے ہیں تاکہ ارد گرد والے لوگوں کو معلوم ہو کہ ہم روپے پیسے والے لوگ ہیں۔ اس نے دل میں سوچا اتنے پیسے خرچ کرتا ہے، جہاز کا کرایہ، گیسٹ ہاؤس کا بل، انجلی کے لیے قیمتی تحفے کیا سب کچھ دکھاوے کے لیے کرتا ہے۔"(18)

سماج میں ظاہری دکھاوا ایک ایسا رویہ ہے جس میں خاندان یا افراد اپنی حیثیت دوسروں پر علم، نیکی، دولت یا مذہب کی صورت میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے وہ اس حقیقت سے خود کو بے نیاز رکھتے ہوں۔ ظاہری دکھاوا والے لوگ عام طور پر دوسروں کو متاثر کرتے ہیں تاکہ دوسروں کی عزت حاصل کی جائے اور خود کو بلند کیا جائے۔ نومارکسیت کے تناظر میں عصر حاضر میں طبقات ابھی تک موجود ہیں۔ طبقات کی تقسیم صرف امیری اور غریبی تک محدود نہیں ہے بلکہ ظاہری دکھاوے کا عنصر بھی شامل ہو چکا ہے۔ گاڑیاں، مہنگے کپڑے، بڑی بڑی تقریبات، اپنی عیش و عشرت کی سوشل میڈیا پر تصاویر اس لیے شئیر کی جاتی ہیں تاکہ سماج کے لوگوں کو متاثر کیا جا سکے۔ ظاہری دکھاوا معاشرے کے اندر بہت زیادہ رونما ہو چکا ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جو قیامت تک جاری رہے گی۔ آبادی کا کثیر حصہ متوسط معیاری زندگی کے تحت زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ جدید دور کے اندر بھی معاشرہ سرمایہ داروں اور جاگیر داروں سے قطعاً خالی نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں غریب اور امیر طبقات کا فقدان ہوا ہے بلکہ متوسط طبقے کے مقابلے میں قدر قلیل ہیں۔

مبین مرزا کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے کہ مبین مرزا نے اپنے افسانوں میں جہاں سماج کے اعلی طبقات اور نچلے طبقات کے نشیب و فراز کو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے وہیں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد، ان کے مسائل و معاملات اور ان کے ثقافتی مسائل کو بڑی خوش اسلوبی سے سامنے لایا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار جس کا بیشتر حصہ سماج کے متوسط طبقے کے ساتھ گزرا ہے۔ طبقے کے روزمرہ مسائل ثقافتی اور معاشی دشواریوں اور ناہمواریوں کی عکاسی اس کے کردار کے ذریعے ملتی ہے کہ معاشرے کے اندر کردار جو بظاہر تو ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے اندر ظاہری دکھاوے کی صورتحال بھی پیدا ہوتی ہے

ظاہری دکھاوا ایک نفسیاتی رویہ ہے جس میں افسانے کا مرکزی کردار اپنی حقیقت یا اصل حالت کو چھپا کر محض دوسروں کو متاثر کرنے یا اپنا ایک مخصوص تاثر قائم کرنے کے لیے مال روڈ میں گھومنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں حالانکہ انہوں نے لینا دینا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف محض اس لیے وہاں گاڑی روکتے ہیں تاکہ دولت مند نیک یا ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہری دکھاوا ایک نفسیاتی بیماری بھی ہے جو سماج کے اندر افراد کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کے اندر احساس کمتری ہو یا عدم تحفظ یا لوگوں کی توجہ طلب کرنے کی خواہش ہو۔ اس طرح افسانے کا مرکزی کردار مال روڈ پر اپنی گاڑی گھڑی کر کے احساس کمتری کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔ لوگوں کی توجہ طلب ان کے اندر موجود ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک بظاہر شان و شوکت دکھائی جاتی ہے۔ کیونکہ انسانی معاشرہ ہمیشہ سے ہی ظاہری چیزوں سے متاثر رہا ہے۔ دولت، لباس، رہن سہن اور ثقافتی عناصر جو فرد کی اصل شخصیت سے زیادہ اس کے ظاہری حلیے کو متاثر کرتے ہیں۔ مبین مرزا نے اپنے افسانے "گمشدہ لوگ" میں معاشرے کی تلخ حقیقت کی عکاسی کی ہے کہ یہ شتے ذاتی یا وقتی مفاد کے گرد گھومتے ہیں:

> "میں مال دار آدمی ہوں۔ ایک لمبا چوڑا خاندان ہے میرا۔ ماں باپ، بہن بھائی، بیوی سب اچھے ہیں۔ بیوی بھی اچھی ہے، سب اچھے ہیں۔ لیکن انجلی ہر رشتہ اپنی ضرورتوں اور ثقافتوں کے مطابق بندھا رہتا ہے۔ اپنے مطالبات کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ ضرورتیں اور تقاضے ہٹائیں جائیں تو رشتہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا مطلب ہے اصل چیز رشتہ تو نہ ہوا، اصل چیز تو ضرورت ہوئی۔ میں اپنی روح میں تنہائی محسوس کرتا ہوں۔ میں ایک ایسے رشتے کا متلاشی ہوں جس کی شناخت اس کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہو سکے۔ لیکن شاید ایسا کوئی رشتہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"(19)

مبین مرزا نے افسانہ "گمشدہ لوگ" میں سماج کے اندر ثقافتی شناخت کے بحران جیسے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ رشتے حساس کے بجائے مفاد پر حامل ہو گئے ہیں۔ عصر حاضر میں انسان اپنی ثقافت کے بحران سے دوچار ہے۔ وہ نہ جدیدیت کا ہی ترجمان ہے اور نہ ہی دولت کا مکمل وارث ہے۔ اس کا ہر رشتہ اب تعلق، احساس اور وابستگی کی بجائے ضروریات اور مفاد سے جڑا ہوا ہے۔ مادی مفاد کی بجائے معاشرے کے گرد گھومنے میں مصروف ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جس کے ارد گرد ماں، بہن، بیوی تمام رشتے موجود

ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود گھر میں تنہائی اور کرب کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ ہر رشتہ اپنی اپنی ضرورت کے تحت جوڑا ہوا ہوتا ہے لیکن کسی کو بھی اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔ سماج کے اندر فرد اپنی ضروریات کے تحت دوسرے افراد سے مل جل کر بظاہر تو رہتے ہیں لیکن سب کو اپنی اپنی ضرورت اور مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ مبین مرزا نے نچلے طبقے کے ساتھ ساتھ سماج کے ان افراد کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جو بظاہر مال و دولت اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ سماج کے اندر ایسے افراد کو عزت اور وقار کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اس افسانے کا مرکزی کردار اندرونی طور پر مایوسی اور اجنبیت کا شکار ہے۔ ان کے جذبات داخلی اعتبار سے ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ اس کو اس بات کی بہت مایوسی ہوتی ہے کہ سماج کے اندر اس کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن گھر کے اندر اس کی حالت بنیادی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ سماج کے اندر ثقافتی بحران کی عکاسی ہے کہ گھر کے اندر نہ صرف بڑے لوگوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے بلکہ ان کے آداب، ان سے باتیں اور ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے کا رواج تھا لیکن اب ایسا نہیں رہا۔

عصر حاضر کے اندر ثقافتی بحران کے حوالے سے دیکھا جائے تو سماج کے اندر ثقافت صرف نمائشی رہ گی ہے۔ فرد نہ صرف ایسے میں اپنے وجود سے کٹ چکا ہے بلکہ وہ اپنی زبان، تہذیب لباس اور فکری بنیادوں سے بھی جدا ہو چکا ہے۔ یہی ثقافتی شناخت کا بحران ہے جہاں انسان احترام یا رشتہ داری کی بجائے استعمال کے لائق چیز سمجھا جاتا ہے۔ مبین مرزا نے اس افسانے میں ثقافتی شناخت کے بحران کو فرد کی ضرورت، مفاد، استعمال اور سماج کے اندر رشتوں کے تناظر میں دیکھا ہے۔ ثقافتی شناخت سے مراد وہ شعور ہے جو فرد کو اپنی زبان، اقدار تاریخ، مذہب اور طرز زندگی کے ساتھ جوڑتا ہے۔ ثقافتی شناخت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہم کون ہیں، ہم کہاں سے آئے ہیں۔ یہ شناخت فرد کو بنیادی اور معنوی حیثیت فراہم کرتی ہے۔ فرد کے رشتے بھی ثقافتی بحران کے نتیجے میں مفاد پرستی اور اجنبیت کا شکار ہو گے ہیں۔ اب ہر رشتہ قربت، احساس اور محبت پر قائم نہیں رہا بلکہ ضرورت، فائدے پر قائم ہے۔ اس بحران کی عکاسی اردو ادب میں مبین مرزا نے ایسے کردار کے ذریعے کی ہے جو مفاد پرستی اور ثقافتی گمشدگی کا شکار نظر آتے ہیں:

> "والد کھلے دل والے آدمی تھے۔ ان کا نظریہ ہر کسی سے اپنے خیالات کی ساجھے داری کرنا تھا۔ ماں اس سوچ کی اتنی مخالف تھی۔ ان دونوں نے اپنی زندگیوں کو ایک دوسرے کو سمجھے بغیر ہی گزار دیں۔ جس میں واحد اولاد ہونے کی وجہ گھر کا ایک اہم فرد تھا۔ دونوں میری رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ ماں اور باپ دونوں ایک دوسرے کو نظر انداز کرتے۔ اس کے باوجود ایک زندگی گزار رہے تھے۔"(20)

خالد فتح محمد نے افسانہ "مزار" میں خاندانی رشتوں میں بدلتی سماجی، نفسیاتی اور معاشی حقیقتوں اور ثقافتی و جذباتی بحران کی عکاسی کی ہے۔ مفاد پرستی اور بدلتے اقتدار کے اثرات خاندان کے اوپر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک بیٹے کا ہے جو گھر میں اکلوتی اولاد ہوتی ہے۔ جس کے والد نرم دل اور برداشت کرنے والے شخص ہوتے ہیں اور گھر میں بہت کم ہوتے

تھے۔ایک مستقل خاموشی ان کے چہرے پر ہوتی ہے۔کئی سوالوں کا جواب ان کی خاموشی دے دیتی تھی۔والد اور ماں کی آوازیں ایک جیسی کبھی نہ تھی۔کی صورتوں کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ان کا تاریخی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیوں کے ساتھ اپنا وجود رہا ہے۔نمایاں اقسام میں سے قبائلی یا مقامی معاشرے، زراعتی یا دیہی معاشرے، فیودل سماج، صنعتی معاشرے، سرمایہ درانہ یا کیپٹلسٹ سماج، بعد صنعتی یا خدماتی سماج اور عصری عالمی سماج تک ایک ارتقائی سفر ہے جس میں مختلف طرح کی ثقافتوں سے وابستہ لوگ زندگی گزارتے آئے ہیں۔

نومارکسیت، کلاسیکی مارکسزم کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔یہ معیشت کو سماج کی مکمل تشریح کا واحد ذریعہ تصور نہیں کرتی بلکہ معاشی، ثقافتی اور نظریاتی باہم انحصار کی پیش کش کرتی ہے۔اس نظریہ کے چند کلیدی نکات کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس کی مفہوم آسانی سے سمجھ آسکتا ہے۔معیشت کے اندر مزدور اور سرمایہ دار کی تقسیم صرف آمدنی کے مسئلے سے تعلق نہیں رکھتے یہ سماجی رتبے، عزت نفس اور معاشرتی شرکت کے حوالے سے گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔جب محنت کو کم تر تصور کر کے مزدور کو غیر مستقل روزگار پر ڈال دیا جائے تو سماج میں غیر مساوی ڈھانچے مضبوطی اختیار کرتے ہیں اور تعلقات میں فاصلہ بھی بڑھ جاتا ہے۔نومارکسی نظریہ یہ بھی بتاتا ہے کہ سرمایہ درانہ نظام میں محنت کی قدر کم تر قیمت میں پرکھی جاتی ہے اس طرح کے استحصال کی بدولت سماجی بے چینی، نفسیاتی دباؤ اور معاشی ناہمواری جیسے مسائل جنم لیتے ہیں۔خاندان، کمیونٹی اور افراد تینوں پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

انتھونی گرامشی اس بات پر بھی واضح طور روشنی ڈالتا ہے کہ صرف جبر سے طاقت قائم رہنے میں دشورای ہوتی ہے بلکہ ثقافتی قبولیت بھی اس کو قائم رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔جب ایک معاشی نظام کی جوازیت کو اسکول، میڈیا، مذیب اور ادب کے ذریعے بڑے پیمانے پر نمایاں کرنے کی کوشش کی جائے تو آہستہ آہستہ لوگ ظلم و جبر کے اس نظام کو فطری یا ناگزیر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔اسی ہجمونی کی بدولت سماجی نظام کو مستحکم کرنے میں کافی مدد ملتی ہے جس سے وقت کے ساتھ ساتھ مزاہمت کے امکانات کمسے کمتر ہوتے جاتے ہیں۔نومارکسیت اس بات کی بھی وضاحت کرتی ہے کہ میڈیا اور ثقافتی مصنوعات اکثر سرمایہ درانہ نظام کے مفاد کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں۔خوشی، کامیابی اور زیادہ پیسہ ایک ہی راہ فلاح کے طور پر دکھائی دیتے ہیں۔اس سے سماجی قدریں اور امیدوں کا بازار کے مطابق تشکیل دیا جاتا ہے۔معاشی مسائل صرف طبقاتی نہیں بلکہ جنس اور نسل کے پس منظر کی بنیاد پر مواقع میں فرق نظر آتا ہے۔عورتیں، نسلی اقلیتیں اور سماجی طور پر پسماندہ گروہ اکثر کم معاوضہ، کم مواقع اور زیادہ غیر یقینی صورتحال کا سامنا کرتے ہیں۔نومارکسیت سماجی ناانصافی کے حل کے لیے ایک جامع نگاہ پر توجہ مرکوز کرواتی ہے۔

تعلیم اور علم کے مقامات اکثر سامراجی ہجمونی کی آواز بنتے دکھائی دیتے ہیں، کیا سکھایا جاتا ہے، کس کو سیکھنے کے مواقع ملتے ہیں اور کون سی تاریخ غالب نظر آتی ہے۔یہ سب معیشت کے تسلط میں جکڑے ہوتے ہیں۔اس سے سماجی شناختیں جنم لیتی ہیں۔

مزید اگر اس کو تعلیمی حوالے سے دیکھا جائے تو تعلیم کے کم وسائل، طبعی سہولتوں تک دشوار رسائی، غیر یقینی روزگار، گھریلو تشدد میں اضافہ اور ثقافتی فرسودگیاں یہ سب معیشت کے ناخواندہ خطوط سے جڑے معلوم ہوتے ہیں۔ ان سب کو سماج کو روز برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لوگ اپنی شناخت کو بازار کی مانگ کے تحت ڈھال کر زندگی گزارتے ہیں۔ رشتے ٹوٹتے ہیں، زبانوں اور تہذیبوں کا صفایا ہو جاتا ہے اور اس سے مزاحمت کے الفاظ دب کر رہ جاتے ہیں۔ الغرض سماج وہ آئینہ ہے جو ہر فرد کو اپنا عکس دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ کبھی بہتر، کبھی مسخ شدہ، نومارکسیت ہمیں یہ کہتی ہے کہ اگر تو قصور فرد کی بجائے نظام کا تصور کیا جائے گا، جب معیشت ایک چالیس کنجی کی مانند ہر دروازہ کھولے یا بند کرے تو افراد سے وہی ہو گا جو اس نے نظام سے سیکھا۔ کس موقع پر چیخنا ہے، کس پل خاموشی اختیار کرنی ہے۔ کس امید کو مقدس سمجھنا چاہیے یہ سب اس میں آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ گرامشی کی فکر یہ باور کرواتی ہے کہ طاقت کا مقابلہ صرف ہتھیار سے نہیں کہانی اور شعور کی بدولت بھی ممکن ہو سکتا ہے۔

حوالہ جات

1. کارل مارکس، داس کیپٹل، مترجم۔ سید محمد تقی (لاہور: دار الشعور میکلیکن، س۔ن)، 21۔
2. عتیق اللہ، پروفیسر، تنقید کی جمالیات (لاہور: بک ٹاک، 2018ء)، 25۔
3. اسرار احمد، ڈاکٹر، بیان القرآن (پشاور: انجمن خدام القرآن، س ن)، 296۔
4. ارشاد گوہر، علم سیاسیات (مغربی بنگال: اردو اکادمی، 1963ء)، 34۔
5. نورالحسن نقوی، فن تنقید اور اردو تنقید نگاری (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2011ء)، 29۔
6. مرتضی علی اطہر، ڈاکٹر، فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت (دہلی: کتابی دنیا دہلی، 2009ء)، 13۔
7. حمیرہ اشفاق، ڈاکٹر، جدید اردو فکشن، عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات (لاہور: شرکت پریس، 2010ء)، 168۔
8. خالدہ حسین، دروازہ (کراچی: خالد پبلی کیشنز، 1996ء)، 123۔
9. فتح محمد ملک، تحسین و تردید (خالدہ حسین کا صوفیانہ انداز نظر) (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز 1995ء)، 99۔
10. فتح محمد ملک، تحسین و تردید، 99۔
11. حمزہ علوی، جاگیر داری اور سامراج (لاہور: گلشن ہاوس، 2012ء)، 58۔
12. خالد فتح محمد، میں (لاہور: عکس پبلی کیشنز، 2019ء)، 11۔
13. خالد فتح محمد، میں، 12۔
14. خالدہ حسین، دروازہ، 83۔

15. ایضاً،78۔
16. نیلوفر اقبال، سیاہ سونا(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2017ء)،56۔
17. احتشام حسین، ادب تہذیبی ورثے کی حیثیت سے، مشمولہ: الکاد کا بہترین ادب، مرتبہ سردار احمد جعفری، ممتاز حسین، جگن ناتھ آزاد اور پرکاش پنڈت (دہلی: مکتبہ شاہراہ 1952ء)،17۔
18. مبین مرزا، خوف کے آسماں تلے (لاہور: فکشن ہاؤس 2004ء)،36۔
19. مبین مرزا، خوف کے آسماں تلے،37۔
20. خالد فتح محمد، میں،36۔

References in Roman Script

1. Karl Marx, Das Capital, mutarjim: Syed Muhammad Taqi (Lahore: Dar-ul-Shu'oor, McLicken, n.a), 21.
2. Atiq Ullah, Professor, Tanqeed ki Jamaliyat (Lahore: Book Talk, 2018), 25.
3. Israr Ahmad, Dr., Bayan-ul-Quran (Peshawar: Anjuman-e-Khadiman-ul-Quran, n.a), 296.
4. Irshad Gohar, Ilm-e-Siyasiyat (Maghribi Bengal: Urdu Academy, 1963), 34.
5. Noor-ul-Hasan Naqvi, Fun-e-Tanqeed aur Urdu Tanqeed Nigari (Aligarh: Educational Book House, 2011), 29.
6. Murtaza Ali Athar, Dr., Faheema Riyaz ki Sha'iri mein Jadeed Aurat (Delhi: Kitabi Duniya, 2009), 13.
7. Humaira Ashfaq, Dr., Jadeed Urdu Fiction: Asri Taqazay aur Badaltay Rujhanat (Lahore: Shirkat Press, 2010), 168.
8. Khalida Hussain, Darwaza (Karachi: Khalid Publications, 1996), 123.
9. Fateh Muhammad Malik, Tahseen o Tardeed (Khalida Hussain ka Sufiyana Andaz-e-Nazar) (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1995), 99.
10. Fateh Muhammad Malik, Tahseen o Tardeed, 99.
11. Hamza Alavi, Jagirdari aur Samraj (Lahore: Gulshan House, 2012), 58.
12. Khalid Fateh Muhammad, Main (Lahore: Aks Publications, 2019), 11.
13. Khalid Fateh Muhammad, Main, 12.
14. Khalida Hussain, Darwaza, 83.
15. Ayzan, 78.
16. Nilofar Iqbal, Siyah Sona (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2017), 56.

17. Ihtisham Hussain, Adab Tehzeebi Virsay ki Haisiyat se, mashmoola: Al-Qa'id ka Behtareen Adab, murattibah Sardar Ahmad Jafri, Mumtaz Hussain, Jagan Nath Azad aur Parkash Pandit (Delhi: Maktaba Shahrah, 1952), 17.
18. Mubeen Mirza, Khauf ke Aasman Talay (Lahore: Fiction House, 2004), 36.
19. Mubeen Mirza, Khauf ke Aasman Talay, 37.
20. Khalid Fateh Muhammad, Main, 36.